محمد آصف قادری

# مولانا شبلی کی مزاحمتی شاعری



مولانا شبلی کی ذات مستجمع الصفات تھی۔ اردو کے اس عظیم ترین انشا پرداز کی اکثر کتابیں اردو کے ادب عالیہ میں شامل ہیں۔ (1) مولانا شبلی کی اردو شاعری ان کے ہم عصر مولانا الطاف حسین حالی کی طرح بہت زیادہ شہرت حاصل نہ کر سکی، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مولانا شبلی نے زیادہ تر فارسی میں شعر گوئی کی؛ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کی بہ نسبت انشا پردازی میں ان کا نام اور مقام زیادہ بلند ہے گو بحیثیت شاعر بھی ان کا مرتبہ کم نہیں تاہم یہاں ہم صرف ان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے حوالے سے ہی تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔

مولانا شبلی کی شاعری میں مزاحمتی رویے کن حالات میں کس ماحول میں پروان چڑھتے رہے اور ان رویوں کی وقوع پذیری کے کون کون سے اسباب و محرکات تھے، یہ سب جاننے کے لیے ہمیں ان کے حالات زندگی، محاسن ذات و شخصیت اور ادبی فتوحات سے بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کی رگوں میں راجپوتوں کا خون دوڑتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ان کی پیدائش اور جنگ آزادی کے آغاز کا وقت ایک ہی تھا یعنی جون 1857! تیسری بات یہ کہ نہایت عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ذی شعور، بالغ نظر اور بڑی بے قرار و بے چین طبیعت کے تھے۔ سر سید کی صحبت، معاصر نامور شخصیات جن میں پروفیسر آرنلڈ، حالی، نذیر احمد، مولانا فاروق چڑیا کوٹی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور مولانا احمد علی محدث وغیرہ شامل تھے، سے قربت، قومی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور ادبی مسائل کا گہرا احساس و شعور ان کی مزاحمتی فکر کی نشو نما میں ممد و معاون رہے۔ یقیناً مولانا شبلی علم و فضل کے ساتھ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی تھے، عربی، فارسی اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وہ اگرچہ مولوی تھے لیکن خشک ملاّ نہ تھے۔ اپنے منصب اور بے شمار قومی کاموں کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ہمیشہ سنجیدہ، متین

اور وضع دار رہتے تھے لیکن ان کی سنجیدگی کسی متقل کی سنجیدگی نہ تھی۔ان میں رندانہ مذاق بھی تھا اور جرأت رندانہ بھی۔

مولانا شبلی کی زندگی کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ انھیں زندگی بھر ذہنی سکون میسر نہ آیا۔ان کا دور واقعی عہد اضطراب تھا یعنی یہ مشرق و مغرب کی آویزش، ایشیا اور یورپ کے ٹکراؤ، قدیم و جدید کی جنگ، علما اور جدید تعلیم یافتوں کی کش مکش، سیاسی خلفشار کی ابتدا اور سائنس و مذہب کے محاربات کا دور تھا۔اس فضا نے انھیں ایک خاص نقطۂ نظر سے سوچنے اور استدلالی و فکری نظر سے صداقت کو پرکھنے کی طرف راغب کیا۔اس بنا پر ان میں خوداعتمادی اور وثوق کا رنگ پیدا ہوا اور دوسروں کی خامیوں پر مدلل نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں طنز و تعریض کا عنصر بھی ابھر آیا۔(2) عبداللہ قریشی کے خیال سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دور کے مخصوص حالات اور ان کا استدلالی انداز تنقید اور مخالف کو طنزیہ اور مزاحیہ پیرائے میں مغلوب یا مرعوب کرنے جیسے حربے ان کی مزاحمتی سوچ کو جلا بخشتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے مولانا شبلی کے حوالے سے نہایت وقیع رائے دی ہے:

''شبلی ایک زبردست مناظر کی طرح مخالف کو بے دست و پا کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔وہ اپنے ہیجان خیز فقروں کے ذریعے مخاطبوں کے دماغ کو مسخر اور مرعوب کر لیتے ہیں اور بالآخر اچانک ایک ضرب کاری لگا کر یا ہلّہ بول کر مخالف کو مغلوب بلکہ مفلوج کر دیتے ہیں اس مقصد کے لیے وہ اپنے کارگر ہتھیار طنز و تعریض سے کام لیتے ہیں۔''(3)

ڈاکٹر موصوف نے مولانا شبلی کے ہیجان خیز فقروں اور کارگر ہتھیار کی بابت بات کی ہے، دراصل وہ ان کی مزاحمتی اپروچ کو واضح کرنے کے لیے ہے۔ڈاکٹر صاحب نے مخالفوں یا مخاطبوں جیسے الفاظ عمومی لحاظ سے استعمال کیے ہیں، انھیں چند شخصیات یا عناصر کے لیے مخصوص نہیں کیا۔درحقیقت استبدادی اور استحصالی قوتوں کے خلاف کی گئی شعری یلغار ہی مولانا شبلی کے مزاحمتی رجحانات کی عکاسی کرتی ہے، معاصرانہ چشمکوں کے نتیجے میں ان کے ردعمل کو مزاحمتی رویہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولانا شبلی کی پیدائش کے وقت ہندوستان میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی اور انگریزوں کے خلاف ایک

مخالفانہ فضا تیار ہو رہی تھی۔ جون 1857 میں مولانا شبلی پیدا ہوئے اور اسی زمانے میں ہندوستانی افواج نے بغاوت کا اعلان کر دیا اور غیر ملکیوں کو ملک سے باہر کر دینے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ ہندوستانی اور انگریز ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہو گئے۔ ہندوستانیوں کی یہ ناکام بغاوت، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ مغلیہ خاندان کی حکمرانی کے دائمی خاتمے پر منتج ہوئی اور انگریزوں نے راست حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ ایسے حالات میں مولانا شبلی نے پرورش پائی۔ خاندان کے علمی ماحول اور اساتذہ کی صحبت نے ان میں علم کا ایسا شوق پیدا کر دیا تھا کہ یہ سلسلہ تادم آخر جاری رہا۔ عین شباب میں انھیں علی گڑھ کے اس ماحول میں سرسید جیسے نباض قوم کی صحبت میسر آئی جہاں مسلمان قوم کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ عقلیت، مقصدیت، استدلالیت اور حقیقت پسندانہ رجحانات نے مولانا شبلی کی نثر اور شاعری دونوں پر زبردست اثرات مرتب کیے۔ اس پس منظر میں شبلی کے ہاں مزاحمت کا رنگ گہرا ہوتا چلا گیا، جو ان کی شاعری میں کئی صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے بجا طور پر لکھا ہے:

> ''شبلی نعمانی، حالی اور نذیر احمد کی طرح متنوع جہات کے ادیب تھے۔ حالی کی خاندانی مفلوک الحالی نے انکسار اور نذیر احمد کی نکر گدائی نے انحصار کے زاویے پیدا کیے تھے لیکن شبلی کے راجپوتی خون نے حریت پسندی کا راستہ قبول کیا اور اظہار فکر و نظر کے لیے وہ نئے نئے میدان حرب و عمل تلاش کرتے رہے۔'' (4)

محکوم قوم کو آزادی اور حقیقی زندگی کا احساس دلانے اور عام مسلمانوں کو باشعور بنانے کے ساتھ ساتھ مولانا شبلی نے اسلام سے محبت کا دعویٰ کرنے والے حجرہ نشینوں کو بھی ہمت کرنے اور عملی طور پر کچھ کر دکھانے کی تلقین کی ہے کیونکہ محض گفتار کا غازی مزاحمت کا ادھورا مظاہرہ کر سکتا ہے، جب کہ حقیقی معنوں میں مزاحمت کو کردار اور عمل کے ذریعے پورے طور پر انجام دینا پڑتا ہے۔

اے مدعیانِ حبّ اسلام — حجروں میں تو اب کرو نہ آرام
دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ — ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ
انداز عرب اگر ہے خو میں — باقی ہے وہ جوش اگر لہو میں
موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ — جو کہتے تھے آج کر دکھاؤ

یہ قومی اور ملی شاعری ہی نہیں قول اور عمل میں یکسانیت دیکھنے کے خواہاں مولانا شبلی کے باطن میں اٹھنے والے جوش وجذبے اور مزاحمتی رویوں کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والی شاعری بھی ہے۔ اسلام کا تمام ظلمت زدہ دنیا پر روشنی بن کر پھیل جانا بجائے خود ایک مزاحمتی عمل تھا کیونکہ اس مکمل ضابطۂ حیات کی وجہ سے ظلم واستحصال کی جگہ انصاف، مساوات، انسان دوستی جیسی مثبت اقدار کا سورج طلوع ہوا۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اس ضمن میں مولانا شبلی کے مطمح نظر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ رائے دی ہے:

''علامہ شبلی نعمانی جہاں تاریخ اسلام کے ذریعے افراد کو اسلاف کی عظمت وسر بلندی سے روشناس کرارہے تھے، وہاں انھیں شاعری کے ذریعے عمل کی ترغیب دے رہے تھے تاکہ وہ پوری طرح تیار ہو کر اپنی کھوئی ہوئی عزت، حریت اور اقتدار کو حاصل کر سکیں۔'' (5)

کر دو جو گذشتہ کی تلافی ثابت ہو زمانے پر کہ اب بھی
گو دورِ فلک ہوا دگر گوں پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی

مولانا شبلی کے مزاحمتی جذبات ان کے کلام میں بار بار ابھرتے اور مسلمانوں میں انقلابی اور مزاحمتی جذبوں کو ابھارتے محسوس ہوتے ہیں۔ 1912 میں حادثۂ کان پور کے بارے میں ان کی نظم ہنگامی اور وقتی نوعیت کی حامل ہے لیکن اس واقعے سے انھوں نے ایک گہرا تاثر قبول کیا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کے لیے یہ ''قومی نقصان'' شخصی نقصان کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ چنانچہ یہ نظم مسلمان قوم کے جذبات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ شاعر کے دل صد پارہ کو بھی بے نقاب کرتی ہے اور اس کے مخصوص مقاومتی رجحان کی عکاسی بھی! اس نظم کے چند اشعار دیکھیے:

پنھائی جارہی ہیں عالمان دیں کو زنجیریں یہ زیور سید سجادِ عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگان خنجر اندازی تو مجھ کو سستیِ بازوئے قاتل کی شکایت ہے
شہیدان وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے عروسِ مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب پہلے جانیں دیں یہ بچے ہیں سویرے ان کو سوجانے کی عادت ہے

کان پور کے محلہ مچھلی بازار کی مسجد کا ایک حصہ بحکم سرکار انگلشیہ گرا دیا گیا تھا۔ جس پر شہر کے مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا تھا اور ایک جلوس کی صورت میں مسجد کی گری ہوئی دیوار پر اینٹیں چننے لگے تھے۔ اس پر فوجی پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کر دی جس کے نتیجہ میں بہت سے بے گناہ مسلمان شہید ہو

گئے تھے۔ ان شہیدوں میں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ اس حادثۂ خونیں نے سارے ملک میں آگ لگا دی اور مسلمان مر مٹنے پر تل گئے۔ مولانا شبلی کی دوسری کئی سیاسی نظموں کی طرح اس نظم میں بھی طنز اور مزاحمت خلط ملط ہو گئے ہیں اور ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول:

''اس طور کے طنز میں ناواجب نشتریت پیدا نہیں ہوئی بلکہ شروع سے آخر تک ایک سنبھلی ہوئی کیفیت قائم رہی ہے۔ ان (نظموں) میں نہ صرف جذبے کو دلیل کے تابع کر دیا گیا ہے بلکہ وہ شگفتگی اور تیکھا پن بھی ہے جو شاعر کے ہونٹوں پر ایک تبسم کی مانند جگمگاتا ہے۔ عام طور سے طنز میں مشفقانہ روش کا نتیجہ حریف کی برافروختگی کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے اور وہ اسی شدت سے جوابی حملہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس شدت سے اسے نشانۂ تمسخر بنایا گیا تھا۔ اس سے طنز کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔''(6)

مولانا شبلی نے اپنے دور کے عام طنزیہ انداز سے روگردانی کرتے ہوئے غیر منصفانہ اور ظالمانہ روش اختیار کرنے والے حکمرانوں اور دیگر طبقوں کی پگڑی اچھالنے کا فریضہ انجام نہیں دیا بلکہ اپنے مزاحمتی اشعار میں ادب عالیہ کی جملہ خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے مؤثر انداز میں طنز کے تیر و نشتر چلانے کی سعی کی ہے۔ اسے سرسید کی صحبت کا اثر سمجھیے کہ 1908 تک وہ انگریزوں کے خلاف سخت مزاحمت کے قائل نہ تھے اور انگریزوں سے مصلحت آمیز سلوک قائم رکھنے کے حق میں تھے، لیکن جب 1912 میں انھوں نے دیکھا کہ جنگ بلقان میں انگریزوں کے ہاتھوں ترکوں کو شدید نقصانات پہنچے ہیں تو وہ انگریزوں سے سخت متنفر ہو گئے۔ ان کی مقاومتی فطرت کے اقتضا نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف مکمل ردعمل کا مظاہرہ کریں۔ اس سلسلے کی اہم ترین مزاحمتی کڑی ان کی نظم ''شہر آشوب اسلام'' ہے۔ واضح رہے کہ یہ نظم کلی طور پر مزاحمتی شاعری کے ذیل میں نہیں آتی لیکن اس کے درج ذیل اشعار میں مزاحمت کے رنگ گہرے اور واضح طور پر نظر آتے ہیں:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو! یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ جوشِ انگیزیِ طوفان بیداد و بلا تا کے یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

پروفیسر وقار عظیم اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''تہذیب انسانی کے استادو! میں طنز کی جو تیزی و تلخی، اور آنے والے تین مصرعوں میں استفہام کی جو عبرت خیز اور عبرت انگیز بے باکی ہے اور پھر آخری دو مصرعوں میں لفظوں کے رواں دواں قافلے کو عطف و اضافت کے رشتے میں جوڑ کر جس طرح جذبے میں ترتیب و تنظیم پیدا کی گئی ہے اس سے نظم میں ابھار اور اٹھان کی وہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے جس کے بغیر کوئی خیال مؤثر نہیں بنتا۔ تاثیر کے اس ڈرامائی حربے سے فائدہ اٹھا کر شاعر پورے جوش سے لیکن نپے تلے قدموں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔''(7)

پروفیسر موصوف سے کلی اتفاق کرتے ہوئے مولانا شبلی کے مزید مقاومتی اشعار بطور مثال یہاں نقل کیے جاتے ہیں تاکہ ان کے مزاحمتی افکار و جذبات کو مزید وضاحت و صراحت سے پیش کیا جا سکے:

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
نگارستان خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خوں چکاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک(8)

مرقومہ بالا اشعار میں ''تہذیب انسانی کے استادوں'' کے سامنے ان کی ستم گری اور عشوہ گری کی جو پردہ دری جس تلخی و تندی سے کی گئی ہے، اس کے آگے ''ظلم و جبر'' کی زبان کے لیے خاموشی و بے زبانی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس سے بڑھ کر مظلوم اور غلام مسلمان قوم کا شاعر کس طرح مقاومت کا اظہار کر سکتا ہے۔ مولانا شبلی نے مظلوم قوم کی وکالت کرتے ہوئے اس کی آہوں کے دھوئیں میں اپنی آہوں کی چنگاریاں شامل کر دی ہیں۔ طنز کے تیر و نشتر کی بوچھار کے بعد ان کی حقیقت میں اور حقیقت شناس نظر ماضی کے آئینے میں جھانکتی اور غم اور مزاحمت کی آمیزش سے بنے گئے احساسات کے زیر اثر آکر لہجے کی طغیانی میں ہمواری پیدا کر لیتی ہے اور بات اس طرح ختم ہوتی ہے:

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

جنگ بلقان میں ترکوں کی ہزیمت پر مولانا شبلی کو نہایت افسوس ہوا۔ بعض لوگ اس وقت انگریزی سرکار کے ڈر سے کہتے تھے کہ ہمیں ترکوں سے کیا غرض ہے۔(9) مولانا شبلی نے ایسے لوگوں کو منافق کہا:

منافق ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ترکوں سے یکسو ہیں یہ وہ الفاظ ہیں جن کی جہانگیری زباں تک ہے
وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساس مسلم کا مگر اس کا اثر جو کچھ ہے بس ہندوستان تک ہے

ظالم کے ظلم کو نہ روکنے والا یا اس کے ظلم کے دوران میں غیر جانب دار رہنے والا ظلم میں شریک ہوتا ہے لہٰذا اس کے خلاف بھی مزاحمت کو مولانا شبلی نے فرض عین سمجھا ہے۔ گو وہ سرسید احمد خاں کے بہت زیادہ قریب جا پہنچے تھے لیکن وہ انگریزوں کی اندھا دھند تقلید کے مخالف تھے۔ انھیں انگریزی داں طبقے کے کھوکھلے پن کا بھی شدید احساس تھا۔ آل احمد سرور نے ٹھیک کہا تھا:

''شبلی پرانے اسکول کے وہ ستارہ تھے جو اپنی فضا سے ٹوٹ کر سرسید کی دنیا میں پہنچ گیا تھا مگر اپنی دنیا کی کچھ چیزیں بھی ساتھ لیتا گیا تھا۔''(10)

مولانا شبلی مسلمان قوم کی اصلاح کے لیے حالی اور ان کے رفقا جیسی تلقین، وعظ اور نصیحت کے بجائے طنزیہ اور مزاحمتی پیرایۂ بیان اختیار کر کے ناہمواریوں کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ انگریزی داں طبقے کو دیکھ کر ان کے خیالات مزید مضبوط ہو گئے تھے کیونکہ ان کے اپنے الفاظ ہیں:

''یہاں آ کر میرے خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی داں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو۔ خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزں کا نام تک نہیں آیا۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش ہے۔''(11)

یہ مولانا شبلی کے جذبات کا ایک عکس ہے جو پین اسلامسٹ تھے۔ پین اسلامی جذبے کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمانوں کو اگر کہیں گزند پہنچے تو ایک کے تلوے کے کانٹے کی خلش دوسرے کے جگر میں محسوس ہو اور اس کے مداوا کی کوشش کی جائے۔ پین اسلامی جذبہ اس وقت مزاحمتی رخ اختیار کر جاتا ہے جب کوئی پین اسلامی کسی بھی قسم کے جابر حکمراں، سامراجی یا استعماری طاقت یا انصاف کے منافی اقدامات اٹھانے والے طبقات کے خلاف سرگرم عمل ہوتا ہے۔ جس وقت سرکار پرست حکومت برطانیہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ کہتے تھے کہ ترکوں کی حکومت سے ہمیں کچھ واسطہ نہیں۔ اس وقت مولانا شبلی نے ان سرکار پرستوں کو منافق کے نام سے موسوم کیا تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹر انصاری ترکی سے واپس پہنچے تو انھوں نے ایک طویل استقبالی نظم پڑھی جس میں ان کے جذبوں کو سراہتے ہوئے فرمایا تھا:

تمھارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی — نہیں ہے سوز اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں — جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں — عجب کیا ہے کہ یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے

ان اشعار میں ڈاکٹر انصاری کے مذہبی و قومی جذبات کو اس انداز میں سراہتے ہوئے بالواسطہ طور پر

مولانا شبلی نے اپنے مقاومتی جذبے کو پیش کیا ہے۔ ترکوں کی عظمت کے ان کے اعتراف میں یہ خیال بھی قابل ذکر ہے:

''بھائی صاحب میں تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ترک اپنی جوتیوں میں میری کھال کا تسمہ بھی لگائیں۔'' (12)

یہ بات انھوں نے اپنے ایک بے تکلف دوست کے سوال کے جواب میں کہی تھی۔ اسی زمانہ یعنی 1912 میں مولانا شبلی نے یہ تجویز پیش کی کہ عید قرباں پر قربانی کے بجائے ان ترکوں کی حفاظت اور اعانت کے لیے قربانی پر خرچ کی جانے والی رقمیں دے دی جائیں، کیونکہ ان کے خیال میں ترک انگریزی سامراج کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے یہ اشعار اسی پس منظر میں کہے گئے تھے:

اے ترک، اے مجسمۂ کبریائے حق — اے وہ کہ جس پہ عالم ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہِ ملتِ ختم الامم ہے تو — تو آج زور بازوئے شاہِ حجاز ہے

یہ ملی یا قومی شاعری ہی نہیں مزاحمتی شاعری بھی ہے کیونکہ اس میں ملت اسلامیہ کی مقاومتی جدو جہد کی بابت اظہار خیال کیا گیا ہے۔ عبدالقادر سروری کے بقول حالی کے معاصرین میں مسلمانوں کے تنزل کے مرثیے کو چھوڑ کر، اگر کسی شاعر نے سنجیدہ غور وفکر کے لیے کچھ خیالات چھوڑے، تو وہ مولانا شبلی ہیں (13)، مولانا شبلی اپنی تاریخی تحقیقات سے اکتا جاتے تو شعر کہنے کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ شاعری میں قومی، ملی اور مقاومتی اور انقلابی جذبات کو شامل کرنا ان کا خاص کمال تھا۔ مولانا شبلی کا لازوال کارنامہ مثنوی ''صبح امید'' ہے جو ایک طرح حالی کے مسدس کا ضمیمہ ہے لیکن مسدس میں اور اس میں کئی اعتبار سے فرق ہے پہلے تو مسدس ایک قنوطی نظم ہے۔ صبح امید کا اصل اصول رجائیت اور مسلمانوں کو شاندار مستقبل کی خوشخبری دینا ہے۔ (14) مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:

وہ قوم کہ جان تھی جہان کی — وہ تاج تھی فرق آسمان کی
گل کر دیے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
روما کے دھوئیں اڑا دیے تھے — اٹلی کو کنویں جھنکا دیے تھے (15)

ان اشعار میں مسلمانوں کی سطوت اور شجاعت رفتہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا شبلی نے قیصر روم اور خسرو ایران کے خلاف حق و انصاف کی فتح کا جو اشارہ دیا ہے درحقیقت اس کے ذریعے نظام بادشاہت

پر خلافت اسلام کی مزاحمتی قوت کے غلبہ پانے کا قصہ چھیڑا گیا ہے۔مولانا شبلی نے ایسے شعر اس دور میں لکھے جس کے بارے میں ڈاکٹر محمد صادق کی رائے میں:

"This was the time when the past was being avidly explored by the MUslims, and it was this enthusiasm which enabled him to find his metier-historical research."(16)

نثر اور شاعری دونوں میں مسلمانوں میں جوش وعمل ہی پیدا کرنے کے لیے کوشش نہیں کی، انھیں ظلم اور جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے مقاومتی اور انقلابی تحریک بھی دی۔ فارسی شاعری میں یہ نظریہ جبر کو آمرانہ اور بادشاہی طرز حکومت کو تقویت دینے کا باعث ٹھہراتا، بادشاہ کو تمام تر خامیوں کے باوجود ظل الٰہی قرار دینا اور بادشاہ کو حاصل لامحدود اختیارات، ان کا غرور و تکبر ایسی تمام باتوں نے ان کے خیال میں کیا کردار ادا کیا، ڈاکٹر محمد صادق کی زبانی سنیے:

"All these killed the spirit of liberty and free inquiry and led to the ethics of slaves, as it is called." (17)

اس سے آگے چل کر ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ حافظ کی شاعری میں صبر وقناعت، ترک دنیا، زندگی کی بے ثباتی وغیرہ کی تلقین، ایرانی آمرانہ نظام کی دین ہے۔ شاعری میں طنز اور سیاست کے حوالے سے مولانا شبلی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں:

"His poems show how quickly Muslim India was emancipating itself from the faith in British civilization which was an article of faith with sayyid Ahmad. There is some veiled satire in Hali. Shibli throws off all disguise and formally annexes politics to poetry.(18)

کسی شاعر کی ساری کی ساری شاعری نہ تو سیاسی ہوتی ہے اور نہ ہی مزاحمتی، ہاں اس کے ہاں سیاست یا مزاحمت جیسے عناصر کا غالب حصہ اس شاعر کی امیج متعین کرنے میں ممد و معاون ضرور ہوتا ہے۔ مولانا شبلی کی شاعری میں مزاحمت کا عنصر پایا جاتا ہے لیکن یہ غیر مزاحمتی عناصر پر غالب نہیں۔ انسان کی خود غرضی اور مادہ پرستی اسے دوسرے انسانوں کا استحصال کرنے کی طرف راغب کرتی ہے، اس استحصال کے نتیجے میں مظلوم انسانوں پر کیسی گزرتی ہے، اس کے بارے میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:

گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا بلاد مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں
مسلمانوں کا قتل عام اور ترکوں کی بربادی نتائج ہائے امید گلیڈ اسٹوں بھی دیکھے ہیں
لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پُرخوں بھی دیکھے ہیں (19)

ان اشعار کے مطالعے سے کیا یہ جاننا مشکل ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے ترکوں کی ہاری ہوئی جنگ کو اپنے قلم کی تیغ تیز سے جیتنے کی سعی نہیں کی ہے؟ برطانوی استعمار کے ظلم و تشدد اور قتل و غارت، ان کے کالے قوانین کے مسلمانوں پر اطلاق کا ایک ہلکا سا نقشہ تھا۔ مولانا شبلی کا انقلابی، مقاومتی اور جذباتی انداز بیان قابل تعریف ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کی رائے ہے:

''شبلی کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے اپنے موضوعات کو داخلی آنچ سے پگھلانے کی سعی کی اور جذبے کی وہ لہر جو حالی اور آزاد کی شاعری میں نسبتاً مدہم ہے شبلی کی شاعری میں تیز نظر آتی ہے۔''(20)

شبلی کی حریت نوازی اور آزادی کے تصورات قابل ذکر ہیں اور اس حریت نوازی میں ان کی اسلام پرور نظمیں بے مثال ہیں۔ مولانا کو انگریز سامراج سے ہی خار نہیں، سامراج پرستوں کی وہ پالیسی جو ان کے نزدیک مسلمانوں کی بقا کے لیے خطرہ تھی دل سے ناپسند تھی۔ وہ بہ حیثیت ایک مسلمان اور شاعر کے اس استعمار سے برسر پیکار تھے۔ پروفیسر مسز ممتاز معین کا خیال ہے کہ انھوں نے بہت سی نظمیں لکھیں، جنھوں نے نوجوانوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ بلاشبہ ان سیاسی نظموں کے ذریعے مولانا شبلی نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اہم حصہ لیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک ان کی چھوٹی چھوٹی قومی، ملی اور وطنی نظمیں جن میں سے بعض تاریخی واقعات پر مبنی ہیں اردو کے وقیع سرمایہ شعری کا حصہ ہیں اور محمود بریلوی کے بقول مولانا شبلی مسلمان قوم میں زندگی کی روح پھونکنے میں علی گڑھ تحریک کے منکر نہیں تھے، لیکن وہ قومی عزت و وقار کی قیمت پر مغربیت کے مضرت رساں نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان تمام آرا کی روشنی میں مولانا شبلی کی سیاسی شاعری کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی طبیعت میں جذباتیت، مذہبیت، حریت کے علاوہ مزاحمت کے اوصاف بھی پائے جاتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی لکھا ہے:

''علی گڑھ تحریک کے بعض مفید اثرات کو انھوں نے بہت جلد قبول کر لیا۔ ان میں سب سے

پہلی چیز ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے۔ ان کے وہ رنگین ترانے جو اب تک حسن وعشق کی جھوٹی کہانیوں سے لبریز ہوتے تھے، اب وہ قوم وملت کے عشق سے خوں افشاں ہونے لگے۔ مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے؟ یہ احساس اب ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا۔''(21)

مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے؟ اس فقرے میں مولانا شبلی ''مسلمان کیا تھے'' کو ''مسلمان کیا ہیں'' میں بدلنے اور دیکھنے کے خواہاں تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں بار بار برطانوی استعمار کے خلاف مختلف پہلوؤں سے مزاحمت اور احتجاج کی صدا بلند ہوئی ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

''شبلی نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں جو نظمیں پڑھی تھیں وہ بڑے پر جوش اور پر درد انداز میں لکھی گئی ہیں۔ جن میں تاریخی واقعات کے حوالے سے مسلمانوں کو غیرت دلائی گئی تھی۔''(22)

اس کانفرنس کے منعقد مختلف اجلاس میں جو نظمیں مولانا شبلی نے سنائیں، ان میں سے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

ہاں کمر بستہ ہو اے قوم ترقی کے لیے — آج کے کام میں اندیشۂ فردا کیسا
نوجوانو! یہ زمانے کو دکھا دینا ہے — اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا
قوم کے تازہ نہالان چمن ہو تم لوگ — دیکھیں پھل لاتا ہے یہ نخل تمنا کیسا
تمھیں جو کام ہیں در پیش گو مشکل سے مشکل ہیں — مگر کرنے پہ آ جاؤ تو آساں سے ہیں آساں تر

مرقومہ بالا اشعار میں قومی ترقی کے لیے تحریک ہی نہیں دی گئی، نوجوانوں کو بلا خوف وخطر جدو جہد کرنے اور ہر مشکل پر قابو پانے کے لیے حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے۔ نوجوان طبقے کو بیبا کی اور جواں مردی کا ثبوت دینے کے لیے عملی طور پر سرگرم کرنے پر زور دیتے ہوئے مولانا شبلی نے بالواسطہ طور پر برطانوی سامراج کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جدو جہد مسلسل کی تلقین کی ہے، جو ایک مزاحمتی رویہ ہے۔ اپنی نظم ''مذہب یا سیاسیات'' میں بھی کسی قوم کی ترقی کا انحصار ان کے نزدیک جن دو باتوں پر ہوتا ہے، جذبۂ دینی یا کوئی جذبۂ ملک و وطن ہوتا ہے:

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو — دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں — کر دیا ذرۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار
یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے — کر دیے دم میں قوائے عملی سب بیدار

اپنی قوم اور ملک کی حفاظت کے لیے جذبۂ دین یا جذبۂ حب الوطنی کو ضروری قرار دیتے ہوئے

مولانا شبلی اپنے ہم وطنوں اور مسلمان بھائیوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ اگر ان میں جذبۂ مقاومت اور جذبۂ حریت پیدا ہو گیا تو ان کو ترقی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایک نظم میں '' حکومت سے خطاب '' کرتے ہوئے اس کے آخری مصرع میں کہتے ہیں:

آپ ظالم نہیں زنہار یہ ہم ہیں مظلوم

ایک اور جگہ انھوں نے حکومت انگلشیہ اور اس کے سامراجی نظام پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

گذری ہے یہ جو کچھ کہ کاشت کاروں پر — داستان الم ناک و غم فزا کہیے
جو مناصب کہ ولایت کے لیے ہیں مخصوص — آج ابنائے وطن بھی تو ہیں اس کے قابل
صیغۂ فوج میں تخفیف مصارف ہے ضرور — سینۂ ملک پہ افسوس کہ بھاری ہے یہ سل

مولانا شبلی نے جنگ بلقان پر جتنی نظمیں لکھی ہیں ان میں طنز کی شوخی، تغزل کی رنگینی، الفاظ کی موزونی ترتیب، لہجے کا اتار چڑھاؤ اور خلوص سے پیدا ہونے والی بیباکی اور صاف گوئی ہر جگہ موجود ہے جو ان کی مزاحمتی طبع کو آشکار کرتی ہے۔ اسی طرح منقولہ بالا مصرع اور مؤخر الذکر اشعار میں اشتراکی خیالات ان کے مزاحمتی رویے کی عکاسی کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اشتراکی نہیں تھے لیکن ترقی پسند ہونے کی وجہ سے ان کے مزاحمتی طرز اظہار کو ان اشعار کے قالب میں روح میسر آئی ہے۔ اسی طرح مندرجہ ذیل اشعار میں ان کے قلم سے مزاحمتی شعلے برستے دیکھیے:

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار — کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم
واقعہ یہ ہے غرض، کوئی نہ مانے نہ سہی — آپ ظالم نہیں زنہار، یہ ہم ہیں مظلوم

برطانوی حکومت نے مسجد کے شہید کرنے اور بے قصور شہیدوں پر گولیاں چلانے کے سلسلے میں طرح طرح کی تاویلیں اور توجیہیں پیش کیں اور مسلمانوں سے صلح پر آمادگی ظاہر کی، تو شبلی نے ایک نظم '' شرائطِ صلح ''، لکھی جس میں انھوں نے بیباکی اور بے خوفی سے مسلمانوں کے احساسات اور قلبی جذبات کی ترجمانی کی۔ نظم کے آخری چند شعر یہ ہیں:

جبر سے برہمی عام کا رکنا ہے محال — یعنی اس خواب پریشاں کی یہ تعبیر نہیں
داد خواہوں سے ہز آنر نے جو ارشاد کیا — کہ '' یہ حکم ازلی قابل تغییر نہیں ''
حسن ظن کے جو گرفتار تھے یہ بول اٹھے — اس مرقع میں بھی انصاف کی تصویر نہیں
ہم اسیرانِ محبت سے یہی ہے جو سلوک — پھر نہ کہیے گا کہ فتراک میں نخچیر نہیں (23)

پھر نہ کہیے گا کہ فتراک میں نخچیر نہیں میں بظاہر ایک خاص واقعہ سے متاثر ہونے والے شاعر کی

طنز آمیز دھمکی ہے، لیکن حقیقت میں ایک آنے والے دور کی زندگی کی پیش بینی اور پیش گوئی ہے اور پیش بینی اور پیش گوئی کی یہ شان بقول پروفیسر سید وقار عظیم صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر کا دل احساس کے نور کی چمک اور جذبے کے شعلے کی لپک کو سمو کر زبان کے حوالے کر دے۔ مولانا شبلی کی سیاسی شاعری کا کوئی حصہ احساس کے اس نور اور جذبے کے اس شعلے کی گرمی سے خالی نہیں اور اسی لیے اسے ایک خالص دور کی سیاسی زندگی کی ''نوائے حق'' کہا جا سکتا ہے۔(24)

وقار عظیم کی رائے میں شبلی کی شاعری اس کے زمانے کی سیاسی زندگی کی ''نوائے حق'' تھی جسے کبھی صدائے احتجاج کی صورت دی گئی اور کبھی مقاومت کی۔ یہ آواز ایک صاحب بصیرت مورخ کی بھی ہے، ایک حق پسند سیاسی مبصر کی بھی اور ایک بیباک شاعر کی بھی، جس نے مصلحت کی راہ کو چھوڑ کر حق گوئی کا مسلک اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔'' ان کی نظمیں ہنگامی واقعات سے ایک شدید تعلق کے باوجود، بقول ڈاکٹر وزیر آغا ایسے حقائق کو طشت از بام کرتی ہیں جو محض ایک دور تک محدود نہیں ہیں اور اسی لیے ان نظموں کے زندہ رہنے کے امکانات نسبتاً زیادہ ہیں۔''(25) مولانا شبلی نے ایک نظم'' جنگ یورپ اور ہندوستانی''، لکھی، جو 1914 کی جنگ عظیم کے بارے میں ہے:

اک جرمنی نے مجھ سے کہا ازرہِ غرور — آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم — اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل — آئیں شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعویٔ غرور — دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور — پھر وہ کہا جو لائق اظہار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں(26)

ڈاکٹر وزیر آغا مولانا شبلی کے ہمدردانہ انداز نظر، خلوص اور تڑپ کے ہی قائل نہیں، الفاظ کے انتخاب میں باسلیقہ ہونے اور مافی الضمیر کے اظہار میں غنائیت سے لبریز نظمیں لکھنے کے معاملے میں بھی ان کی عظمت کے معترف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

''افسوس ہے کہ شبلی مرحوم نے اپنی قادر الکلامی کو محض ہنگامی موضوعات تک محدود رکھا۔''(27)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی نے ہنگامی اور وقتی موضوعات پر مزاحمتی شاعری کرنے کے باوجود

اس کو ادب عالیہ کے معیار سے گرنے نہیں دیا۔ حالانکہ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہنگامی شاعری تھوڑی سی دیر میں اپنا جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے لیکن مولانا شبلی نے اپنے دور کی منظوم تاریخ اس انداز میں رقم کی جو آج بھی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے شعری موضوعات قومی ہوں یا ملی، اخلاقی ہوں یا اصلاحی، مذہبی ہوں یا سیاسی، ہنگامی ہوں یا وقتی ان پر طبع آزمائی کرتے ہوئے وہ اپنے مزاحمتی افکار کو نت نئے انداز سے آشکار کرتے ہیں۔ اردو میں مزاحمتی شاعری کا کوئی محقق یا نقاد جب بھی ایسی شاعری کو زیر بحث لائے گا، مولانا شبلی کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کر پائے گا۔

---

**حوالہ جات:**

1۔ معین الدین احمد انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، تعارف و تاثر از ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص 1، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی بار اول: 1967

2۔ عبداللہ قریشی، اردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر۔ شبلی، ص: 741، بحوالہ نقوش طنز و مزاح نمبر، لاہور جنوری، فروری 1959

3۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، بحث و نظر، ص 155، مطبوعہ: لاہور، 1952

4۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص 286

5۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن، تحریک آزادی میں شعرا کا حصہ، ص 13، بحوالہ ماہ نو، لاہور، اگست، ستمبر 1994

6۔ ڈاکٹر وزیر آغا، شبلی کی سیاسی نظمیں، ص 28-126، مشمولہ مقالات شبلی، ترتیب خان عبید اللہ خان، اردو مرکز لاہور، بار اول: 1961

7۔ پروفیسر وقار عظیم، شبلی کی سیاسی شاعری، ص 32، مشمولہ مقالات شبلی

8۔ سید سلیمان ندوی، مرتب: کلیات شبلی، ص 98، اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی، پہلا پاکستانی ایڈیشن: 1985

9۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر، تاریخ ادب اردو، ص 510

10۔ عبداللطیف اعظمی، مرتب: شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص 6، مطبوعہ دہلی 1945

11۔ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی جلد اول، ص 54 / بحوالہ موج کوثر از شیخ محمد اکرام، ص 227، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور طبع شانزدہم 1990

12۔ خان عبید اللہ خان، مرتب: مقالات یوم شبلی، ص16

13۔ عبدالقادر سروری، جدید اردو شاعری، ص102-103

14۔ ایضاً، ص105

15۔ شبلی نعمانی، کلیات شبلی، مرتبہ ومقدمہ: سید سلیمان ندوی، ص19-20

16۔ Muhammad Sadiqe, A History of ibid,p.283

17۔ ibid, p.281

18۔ Urdu Literature

19۔ شبلی نعمانی، کلیات شبلی، ص101

20۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص403

21۔ پروفیسر مسز ممتاز معین وغیرہ، تاریخ علی گڑھ تحریک، ص238، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، بار اول: ستمبر 1981

22۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، اردو ادب 1857 تا 1966 ص43، مکتبہ خیابان ادب، لاہور طبع اول: ستمبر 1967

23۔ نعمانی، کلیات شبلی، ص132

24۔ وقار عظیم، شبلی سیاسی شاعری، ص45، مشمولہ مقالات یوم شبلی

25۔ ڈاکٹر وزیر آغا، شبلی سیاسی نظمیں، ص128، ایضاً

26۔ شبلی نعمانی، کلیات شبلی، ص160

27۔ ڈاکٹر وزیر آغا، شبلی کی سیاسی نظمیں، ص129


●


پتہ:

Head Deptt. of Urdu
Govt. Islamia Post Graduate College
Gojrawanla, (Pakistan)

**National Council for Promotion of Urdu Language**
Quarterly "FIKR-O-TAHQEEQ" New Delhi
Vol. XIII Jan. Feb. March 2010 Issue-1

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا علمی و تحقیقی جریدہ

# سہ ماہی فکر و تحقیق نئی دہلی

| | | |
|---|---|---|
| اس شمارے کی قیمت | : | 25 روپے |
| زرِ سالانہ — | | |
| عام ڈاک سے | : | 100 روپے |
| رجسٹرڈ ڈاک سے | : | 200 روپے |
| طابع اور ناشر | : | ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان<br>محکمۂ اعلیٰ تعلیم، وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند |
| فون | : | 26103938, 26103381 |
| مدیر | : | **ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ** |
| مشیر | : | **مخمور سعیدی** |
| کمپوزنگ | : | محمد مشہود عالم |
| خط و کتابت کا پتہ | : | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک ۔1، ونگ ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066 |



ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ایس. نرائن اینڈ سنز، بی ۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز ۔II، نئی دہلی 110020 میں 70GSM TNPL پیپر پر چھپوا کر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک ۔1، ونگ ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066 سے شائع کیا۔

سہ ماہی

# فکر و تحقیق

نئی دہلی

شمارہ 1

جنوری، فروری، مارچ 2010

جلد 13

مدیر

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

مشیر

مخمور سعیدی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

فکر و تحقیق
سہ ماہی
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی